ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.5,Issue No.2(2023)
(July to September)

خدیجہ مستور کے ناول آنگن کا مطالعہ: مابعد نو آبادیاتی تناظر میں

Study of Khadija Mastoor's Novel Aangan: In a Post-Colonial Context

جویریہ ظفر
ویزیٹنگ لیکچرار، شعبہ اُردو، ایمرسن یونیورسٹی، ملتان
محمد احمد صدیقی
ایم۔ایس اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
حافظہ کہکشاں علی
پی ایچ۔ڈی اُردو اسکالر، شعبہ اُردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

Jawaria Zafar
Visiting Lecturer, Emerson University,Multan
Muhammad Ahmad Siddiqui
MS Urdu, International Islamic University, Islamabad
Hafiza Khakshan Ali
Doctoral Candidate, Department of Urdu,The Women University,Multan

Abstract:
After the War of Independence, the best literature flourished in the Late Nineteenth Century and Early Twentieth Century, because the literature created in this period was the best representative of its era in all perspectives of Political,Social and Economic purposes .In order to explore the universal truths of Literature, it is necessary to study new Readings and new Dimensions of each piece of Literature because with the passage of time, Ideas also change and the main reason for this is that in Research Nothing is final in the world because only a Researcher can breathe new life into a piece of literature by examining it and gives this creation familiarity with new Aspects. It has become a common practice among us to study Literature under New Critical Theories so that new Readings and new Meanings of Literature can come out in the best Research way. When we study the tradition of the novel in the context of the Political and Social scenario of the modern age, the fact becomes clear that the contemporary situation is not entirely devoid of the traditions of the Past, but it is an expression of the problems arising from within the Society. In this paper, Khadija Mastoor's novel "Angan" will be studied in the post-colonial context.

Keywords: Independence, Contemporary, Society, Post Colonial,Cultural, Traditions, Colonial Era, Critical Theories, Social scenario.

انسان معاشرے کا بہترین تخلیقی عکس ادب میں پیش کرتا ہے ادب میں رونما ہونے والے داخلی اور خارجی تضادات معاشرے کے معروضی حالات سے پھوٹتے ہیں اور ان حالات سے اجتماعی زندگی اور بالخصوص ادب ضرور متاثر ہوتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں بہترین ادب پروان چڑھا۔ کیونکہ اس دور میں تخلیق ہونے والا ادب سیاسی و سماجی، معاشرتی و معاشی غرض ہر لحاظ سے اپنے دور کا بہترین ترجمان رہا۔ مسلم تاریخ میں ۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کا دن

اہمیت کا حامل ہے کہ اس دن مسلمانوں نے وہ آزاد مملکت حاصل کی جس کے لئے وہ صدیوں سے کوشاں تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد کئی قسم کے منظر نامے وجود میں آئے۔ قیام پاکستان کے بعد یعنی مابعد نو آبادیاتی عہد میں جن ادبی روایات نے اپنے نقش ابھارے وہ ماضی کی روایات کی شباہتوں سے یکسر عاری نہیں تھے بلکہ معاشرے کے بطن سے جنم لیتے مسائل کے ترجمان تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تخلیق ہونے والا ادب بھی نو آبادیاتی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا رہا۔ نو آبادیاتی دور میں ناول بطور بہترین صنف سامنے آیا اور قیام پاکستان کے بعد کئی ایسے ناول نگار منظر عام پر آئے جنہوں نے نو آبادیاتی نظام کی قباحتوں کو واضح انداز میں پیش کیا۔ ان ناولوں میں قرۃ العین حیدر کا ناول "میرے بھی صنم خانے"، شوکت صدیقی کا "خدا کی بستی"، غلام عباس کا "کتبہ"، عزیز احمد کا "ایسی بلندی ایسی پستی"، جمیلہ ہاشمی کا "تلاش بہاراں"، انتظار حسین کا "بستی"، خدیجہ مستور کا "آنگن" اور "زمین" وغیرہ شامل ہیں۔

ادب کی آفاقی صداقتوں کا کھوج لگانے کے لئیے ضروری ہے کہ ہر ادب پارے کی نئی پڑھت اور نئی جہتوں کا مطالعہ کیا جائے کیونکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نظریات میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ تحقیق کی دنیا میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی کیونکہ ایک محقق ہی کسی ادب پارے میں جانچ پڑتال سے اس میں نئی روح پھونک سکتا ہے اور اس تخلیق کو نئی رفعتوں سے واقفیت عطا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رواج عام ہو گیا ہے کہ ادب پارے کا نئی تنقیدی تھیوریز کے تحت مطالعہ کیا جائے تا کہ ادب کی نئی پڑھت اور نئے معانی بہترین تحقیقی انداز میں سامنے آسکیں۔ جب ہم ناول کی روایت کا مطالعہ جدید عہد کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کی تناظر میں کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عصر حاضر کی صورت حال ماضی کی روایات سے یکسر عاری نہیں ہے بلکہ معاشرے کے بطن سے جنم لیتے مسائل کی ترجمان ہے۔ اس مقالہ میں خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کیا جائے گا۔ یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی جائے گی کہ نو آبادیاتی عہد میں جن سیاسی رویوں نے جنم لیا، ناول نگار نے "آنگن" میں ان سیاسی نظریات کی پیشکش کس انداز سے کی؟ مصنفہ ہمارے اس قومی، ثقافتی اور سیاسی بحران کو واضح کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟ بیسویں صدی میں تخلیق کردہ یہ ناول کس حد تک ہماری موجودہ صورت حال کا نمائندہ نظر آتا ہے؟ انہیں مباحث کی مدد سے ہم باآسانی اس ناول کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کر سکتے ہیں۔ ان سوالات پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فریم ورک کی وضاحت کی جائے جس پر یہ تحقیقی مقالہ بنیاد رکھتا ہے۔ مابعد نو آبادیات ایک مکمل تنقیدی ادبی تھیوری کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے۔ انگریزی ڈکشنری میں اس اصطلاح کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> "Post colonialism is the critical academic study of the cultural legacy focusing on the human consequences of the control and exploitation Of colonized people and their lands. More specifically, It is a critical theory analysis of the history , culture, literature and discourse of imperial power"(1)

مابعد نو آبادیات ایک سیاسی، ثقافتی اور بالخصوص ادبی اصطلاح ہے۔ "پوسٹ کلونیلیزم ایک خاص صورت ہے جس کی واضح پہچان اور شناخت اجتماعی ڈھنگ سے ۱۹۸۰ء کے آس پاس شروع ہوتی ہے اور جس کا دامن، کلونیلیزم کی نجات سے دنیا کی نئی گھیر ابند سیاست نیو ورلڈ آرڈر کی مخالفت سے، سوشلسٹ عوامی جدوجہد تک پھیلاؤ اور جس میں انتزاع سویت روس کے مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں اس لئے اب یہ اصطلاح صرف سیاسی اصطلاح نہیں رہی بلکہ مغرب میں تو یہ ادبی تحریک یا ادبی تھیوری بنی ہے "(۰۲) ۱۹۷۸ء میں ایڈورڈ سعید کی تصنیف شرق شناسی کی اشاعت کے بعد سے اب تک بحث کا ایک سلسلہ جاری ہے جس میں کالونیل ڈسکورس کے تحت مابعد نو آبادیات کا دائرہ کار متعین کرنے کے لئے مختلف زاویہ ہائے نظر ملتے ہیں۔ "پس نو آبادیات ایک نہایت

جامع اور پیچیدہ تصور اور تنقید طریقہ کار کی حیثیت سے پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کی تھیوریز میں تقریباً ۱۹۹۰ء کے آس پاس شامل ہو گیا اس کی رو سے اس مغربی فکر و تہذیب کا بطلان کرنا تھا جس کی تشکیل میں ارسطو، ڈیکارٹ، کانٹ، ہیگل، مارکس یا پھر ہومر، دانتے، کولرج اور ٹی ایس ایلیٹ کی تحریروں کا نمایاں حصہ تھا اور جو ایک وحدانی تصور کی حیثیت سے الگ آفاقی اور عالم گیر شکل اختیار کر چکا تھا۔ پس نو آبادیاتی ادب اور تہذیب کسی بھی وحدانی فکر کے بلکل خلاف ہے کیوں کہ اس سے ادب اور دوسری سرگرمیوں میں جنس، تہذیبی تشخص اور دوسرے چھوٹے چھوٹے مسائل دب جاتے ہیں اور اس کی جگہ امپیریلزم کا ڈسکورس حاوی ہو جاتا ہے "(۳)۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد قیام پاکستان تک باقاعدہ برطانوی حکومت قائم رہی اور ۱۹۴۷ء میں انہیں یہ ملک چھوڑنا پڑا لیکن ان کی آمد کے بعد کئی صدیوں کے جو اثرات ہم پر مرتب ہوئے ہم ان سے صرف نظر نہیں کر سکے۔ نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے اردو ادب میں بہت سے لکھنے والے سامنے آئے جنھوں نے نو آبادیاتی دور کی قباحتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی۔

ان تصریحات کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں اردو ادب میں مابعد نو آبادیاتی تھیوری ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ زیر بحث آنے لگی اور عصر حاضر میں اس فریم ورک کے تحت کام زیادہ تواتر اور فہم و فراست سے کیا جا رہا ہے۔ مابعد نو آبادیات دراصل " کالونیل ڈسکورس "کا مطالعہ ہے نو آبادیات یا استعماریت کا خاتمہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا اور یہیں سے مابعد نو آبادیاتی دور شروع ہوا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مابعد نو آبادیاتی دور میں ہر دو طریقے سے آزادی حاصل ہوئی میڈیا فقط تجارتی نہیں ہوا بلکہ اس نے عدم تحفظ کے احساسات میں شدت پیدا کی۔ مختلف کمپنیاں اس بیانیے میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں ہر شخص اس تھیوری کی مدد سے خود کو گلیمر کے سہارے زندہ رکھنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی تھیوری اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ معاشی و معاشرتی ، سیاسی و سماجی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر ہم نے خود کو مشینری کے حوالے کر دیا ہے، نو آبادکاروں نے جو نظام اپنی ضرورت کے تحت استوار کیا ہم اسی کارپوریٹ کے غلام بنتے چلے گئے۔ ان تصریحات کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعد نو آبادیات ایک ایسی معاشی، سیاسی اور ادبی اصطلاح ہے جس نے ظلم و بربریت اور قبضہ کا تصور رائج کیا اور قوموں کی ذہنی محکومی کی واضح صورت متعین کی۔

جب ہم خدیجہ مستور کے ناولوں کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ناول آنگن کی فضا سازی برصغیر میں موجود ان حالات کو پیش کرتی ہے جو نو آبادیاتی نظام کی دین تھی۔ خدیجہ مستور کا ناول آنگن ۱۹۶۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا موضوع برصغیر کی تقسیم کے معاشرتی اور سیاسی پس منظر میں پیش آنے والے واقعات ہیں ، قیام پاکستان سے پہلے جب انگریز ہندوستان پر مکمل طور پر قابض تھے اور نو آبادیاتی نظام اپنے طور جڑیں اس قدر مظبوط کر چکا تھا کہ لوگ اس جبری فضا میں بھی انگریزوں کے پروردہ کہلانا پسند کرتے تھے اور پھر یہی طبقات پاکستان میں ہجرت کرنے کے بعد ملک کی تہذیب و ثقافت کے قاتل بنے، مسلمانوں کی ذہنی کشمکش، قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کی معاشرتی کیفیت ، تقسیم سے پہلے ہی خاندانوں کی تقسیم، قیام پاکستان کے بعد ثقافتی اور سیاسی بحران اور جبر و اختیار اور بے یقینی کی ایسی فضا ناول میں نظر آتی ہے جس نے ہر سطح پر باشعور انسان کو متاثر کیا۔ اور یہی موضوعات ناول کا مابعد نو آبادیاتی تھیوری کے تحت مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اگر ہم ناول "آنگن" میں موجود کرداروں کے سماجی رویوں کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تھیوری کے تحت کریں تو نو آبادکاروں کے بچھائے گئے جال اور تشکیل دی گئی دنیا کا منظر نامہ واضح نظر آتا ہے۔ ہم ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک یا قیام پاکستان کے بعد کے منظر نامے پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ناول میں صرف ایک گھر آنگن کی کہانی ہی نہیں، بلکہ پورے ہندوستان

کا سماجی ڈھانچہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند، ادب اور مذہب کے متعلق مختلف نظریات کو حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ پھر وہ آنگن صرف ایک خاندان کا نمائندہ نظر نہیں آتا بلکہ اس عہد کے ہر گھر آنگن کی کہانی اور سماجی صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔

اگر ہم عالیہ کے کردار کا مطالعہ کریں تو وہ ناول میں مرکزی کردار کے طور پر سامنے آتی ہے۔ سماج اور معاشرے سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود روایات اور قدروں کی امین ہے اس کے کردار میں ٹھہراؤ اور خودداری کا عنصر ایک مخصوص رویے کا ترجمان ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جو انگریزوں سے مرعوبیت کا شکار نہیں تھا ہر صورت مشرقی روایات کی پاسداری کا متمنی دکھائی دیتا تھا حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد بھی انہیں کرداروں نے سب سے زیادہ صعوبتیں جھیلیں کیونکہ جب انہوں نے فسادات، لوٹ مار اور بے ایمانی کی اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تو ایسے تہہ دار کردار زیادہ عرصہ اپنا احتجاج ریکارڈ نہیں کروا سکے بلکہ ہر سطح پر زندگی کی قوتوں سے سرشار ہونے کے باوجود تشنگی اور احتجاج ایسے جذبات سے عاری رہے۔ ان کرداروں میں تہذیبی رکھ رکھاو، شعوری نفاست اور عصری تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگی کے باوجود یہ خاموش تماشائی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ عالیہ کے برعکس ناول میں دوسرا کردار چھمی کا تخلیق کیا گیا جو نہ تو تربیت یافتہ ہے اور نہ تعلیم یافتہ بلکہ ماں باپ کے دست شفقت سے محروم یہ کردار حساس ہے مثال کے طور بڑے چچا اس سے محبت نہیں کرتے صرف ان کی مخالفت مول لینے کے لیے وہ کانگرس کے خلاف نعرے لگواتی ہے۔ پورے ناول میں اسے بچوں سے جلوس اور ریلیاں نکلواتے دکھایا گیا لیکن آخر میں جب پاکستان بن گیا تو وہ کردار منجمند اور خاموش تماشائی کی صورت سامنے آیا ناول کا اقتباس دیکھیں۔

> "چھمی کا خط آیا تھا۔ اس نے کیا لکھا ہے عالیہ؟ بڑی چچی نے پوچھا اس نے لکھا ہے کہ پاکستان جانا مبارک ہو۔ ضرور جایئے اس پاک سرزمین کو میری طرف سے چومئے گا اور مجھے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھی بھیج دیجئیے گا میں اسے اپنی مانگ میں لگاؤں گی، میں بدنصیب تو وہاں بھی نہیں جا سکتی"
>
> (۴)

آزاد فضا میں سانس لینے کی خواہش مند عوام ہندوستان میں کثیر تعداد میں نظر آتی تھی وہ سب کے سب خودرو پودے کی مانند کسی طرف بھی نکل سکتے تھے۔ چھمی کا کردار ہندوستان میں موجود ان تمام سیاسی کارکنوں کے دوغلے رویے کی منہ بولتی تصویر ہے جو صرف تماشبین کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں اور انتشار کی کیفیت کو ہوا دینے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے سماجی اور سیاسی حالات کی کشیدگی کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"جلوس قریب آ گیا تھا۔ بچے بڑے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ "مسلم لیگ زندہ باد، قائداعظم زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دھتیاراج نہیں ہو گا، چڑیاراج نہیں ہو گا"۔

عالیہ چھت کی منڈیر پر سے جھک کر گلی میں جھانکنے لگی، دو بڑے لڑکے مشعلیں اٹھائے سب سے آگے تھے۔

"نہیں دیکھنے دیا ظالم نے"۔۔۔۔۔۔۔ چھمی بھاگتی ہوئی آئی اور عالیہ کے برابر کھڑے ہو کر نیچے گلی میں آدھی لٹک گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"ہائے کیسا شاندار جلوس ہے، وہ آپ کے بڑے چچا نے مجھے دروازے سے جلوس نہیں دیکھنے نہیں دیا، جل کر خاک ہو گئے حضرت"۔

"چھمی ذرا سرک کر جھانکو کہیں جلوس کے ساتھ تمہاری لاش بھی نہ نکل جائے" عالیہ نے چھمی کے لٹکے ہوئے دھڑ کو اپنی طرف کھینچا۔

"ہائے بجیا میں نے مشعلیں کیسی بنائی ہیں، ہیں نا؟" چھمی نے داد طلب نظروں سے دیکھا
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"آج تو بڑے چچا جلتے جلتے ختم ہو جائیں گے"۔"چھمی کیسی باتیں کرتی ہو،
چھمی بس پتہ چل گیا کہ لیگی ویگی کچھ نہیں ہو، بڑے چچا کو جلانے کے لئے یہ سوانگ رچایا ہے"
"واہ، ہوں کیوں نہیں"، وہ شرمندہ سی ہو گئی۔(۵)

درج بالا اقتباس صرف چھمی کے باغیانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویے کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ یہ اس پورے طبقے کا نمائندہ کردار ہے جن کے نام نہاد اور کھوکھلے دعوؤں نے پاکستان ایسے معاشرے کو کبھی مستحکم نہیں ہونے دیا اور عوام کے اسی غیر سنجیدہ رویے نے ترقی کے وہ تمام راستے مسدود کر دیئے جو کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی شناخت ہوا کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ناول نگار نے جمیل ایسا کردار تخلیق کیا جو آنگن میں حال کے حصے کا ہیرو نظر آتا ہے اس کی شخصیت میں جگہ جگہ جھول اس کی ذات کے کئی نشیب و فراز کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔

اس کردار کا مطالعہ جب ہم نو آبادیاتی تناظر میں کرنے کی کوشش کریں تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ کردار پورے ہندوستان کی نوجوان نسل کا نمائندہ نظر آتا ہے جسے بظاہر کئی فکروں نے گھیرا ہوا ہے لیکن وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے گھر "آنگن" میں موجود دوسرے لوگوں کو ہر غلطی کا قصوروار ٹھہراتا ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے ذریعے اس حقیقت کو بھی نمایاں کیا ہے جس سے ہم آج تک صرف نظر کرتے آرہے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان میں کئے طرح کے رویے جنم لے چکے تھے کئی سیاسی پارٹیاں جو بن پر تھیں اور ہر جماعت کے ساتھ کئی ایسے جذباتی نوجوان لوگ شامل تھے جو اپنی پارٹی اور لیڈروں کے بنائے گئے ہر قسم کے نظریات کو درست مانتے اور یہی لوگ ان کا دفاع کرتے نظر آتے لیکن اس سارے نظام میں کہیں بھی حقوق کا تحفظ نظر نہیں آتا۔ مراعات کی غیر منصفانہ تقسیم جو نو آبادیاتی نظام نے رائج کی تھی وہ آج تک کسی طور ختم نہ ہو سکی اور یہی عوامل ہمیں اس ناول کے کرداروں کا مطالعہ مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس دور میں وہ متوسط طبقہ جو معاشی، معاشرتی اور سیاسی طور پر ہندوستان کو مستحکم دیکھنا چاہتا تھا انہیں لوگوں نے سیاسی لیڈروں اور پارٹیوں کے پیچھے اپنے گھر بار کی پرواہ کئے بغیر ہر ذمہ داری سے بے نیاز اپنی پارٹی کا دفاع کرتے نظر آئے لیکن پھر اسی طبقے کو ہر قسم کے فائدے سے کوسوں دور رکھا گیا۔

پاکستان کے قیام سے پہلے ہی ایک ایسی صورت حال جنم لے چکی تھی جس نے ہمیں صرف انگریزوں کا محکوم نہیں بنایا تھا بلکہ انگریز اپنے مفادات کے لئے جو طبقات وجود میں لایا تھا انہیں لوگوں نے اپنے ارد گرد کی عوام کو نشانہ بنایا اور اپنے زیر نگیں اس انداز سے کیا کہ وہ اپنے ہی گھروں اور خاندانوں سے دور ہوتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر جب ہم بڑے چچا کے کردار کا مطالعہ اس تناظر میں کرنے کی کوشش کریں تو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنا سب کچھ اپنی جماعت سے وابستہ کر رکھا تھا۔ گھر کے ہر فرد سے محبت جتانے والا یہ کردار جب چھمی کے منہ سے کانگرس کے خلاف نعرے بازی سنتا ہے تو اس کی زبان کھینچنے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا حتیٰ کہ اسے مارنے سے بھی اجتناب نہیں برتتا کیونکہ اس دور میں سیاسی کارکنوں کے نتیجے میں صورت حال یہ رخ اختیار کر چکی تھی کہ اظہار خیال کی آزادی کے ساتھ ساتھ نظریات کی آزادی پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی جمیل ایسا کردار کئی بار چچا سے اس بات پر بحث کرتا دکھائی گیا جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہم نے سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں ہی نقصان اٹھایا ہے۔

"مگر آپ نے اسے مارا کیوں، آپ اسے سمجھا بھی تو سکتے تھے، اس کی بد تمیزی کو روک سکتے تھے
، مگر مارنا کہاں کا انصاف ہے، وہ اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے تو آپ چڑتے کیوں ہیں۔ جب آپ

لوگوں کو نظریے کی آزادی نہیں دیتے تو اپنا ملک کس طرح سے آزاد کرائیں گے اور اگر آپ کا ملک آزاد ہو بھی گیا تو اس آزادی کو کیسے بر قرار رکھیں گے ؟" جمیل بھیا نے بڑے جوش سے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا "(۶)

اس صورتحال کو اگر ہم پاکستان کی موجودہ صورت حال پر منطبق کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ رویہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک جوں کا توں موجود ہے خیالات اور اظہار کی آزادی ہر سطح پر مفقود ہے۔ ان تصریحات سے بڑے چچا کے کردار کی کئی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں اور وہ ایک ایسے مخصوص طبقے کے ترجمان بن جاتے ہیں جن کے اثرات ہم ہر عہد کی نوجوان نسل میں محسوس کر سکتے ہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ ہماری نسل کی ایک کثیر تعداد تعلیم سے اس لئے بھی دور رہی کہ ان کے وڈیرے ملکی سرگرمیوں میں منہمک تھے اور تربیت کے ہر پہلو کو یہ کہہ کر پس پشت ڈال دیا جاتا تھا کہ بس آزادی کے بعد سب اچھا ہو گا اور ہم آزاد فضاؤں میں بہتر طریقے سے جی سکتے ہیں ان کے اس عمل نے ملک و قوم کو شدید متاثر کیا جس وجہ سے ہم آزادی اور قربانی ایسے مخلص جذبوں کے معانی و مفاہیم سمجھنے سے قاصر رہے اور اپنی آنے والی نسل کو بھی ان اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ جمیل کا کردار کئی رویوں کا ترجمان نظر آتا ہے:

"آپ میری قابلیت کی بات نہ کیا کریں، آپ نے تو مجھے صرف پرائمری تک پڑھا کر گلی ڈنڈا کھیلنے کو چھوڑ دیا تھا اور پھر ملک آزاد کرانے لگے تھے، جیسے میں تو آپ کے ملک کا باشندہ تھا ہی نہیں، جیسے مجھے تو اچھی زندگی گزارنے کا حق ہی نہ تھا۔ میں نے بی۔اے نہیں کیا ہے، لوہے کے چنے چبائے ہیں۔ ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ جب آپ کو ایک گھر کا خیال نہیں تو اتنے بڑے ملک کے اتنے بہت سے گھروں کا کس طرح خیال کریں گے۔ یہ بھی خوب رہی کہ ایک گھر کو قربان کر کے دو گھروں کو بچالو"(۷)

اس قسم کی شدت پسندی نے معاشرے میں کئی طرح کے رویوں کو جنم دیا جو مثالی معاشرے کے خواب کی تکمیل میں حائل رہے۔ مخصوص جاگیر دارانہ ماحول کے زیر اثر ناول میں موجود گھر آنگن میں کریمن بوا، صفدر، اسرار میاں، تہمینہ، کسم دیدی اور شکیل ایسے کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ کردار سماجی و معاشرتی سطح پر متضاد کیفیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ تہمینہ اور کسم دیدی ایسے کردار جو خود کو ناول کے کینوس پر زیادہ عرصہ باقی نہیں رکھ سکے معاشرے کی کئی ایسی قباحتوں کو واضح کر گئے جن سے ہم آج تک صرف نظر کرتے آرہے ہیں۔ صفدر، اسرار میاں، شکیل یا کریمن بوا ایسے کرداروں کے سماجی رویے کا مطالعہ اگر ہم مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ کردار اس عہد کے وہ چہرے ہیں جو ریاستی طاقتوں کے نظام اور بالخصوص جاگیر دارانہ نظام کی وجہ سے ہر سطح پر استحصال کا شکار نظر آتے ہیں۔

اس تناظر میں جب ہم کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہم پر کئی سال حکومت کی اور ہمیں اپنا غلام بنایا جب ہم غلامی کی نوعیت کی بات کرتے ہیں تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے ہم صرف انگریزوں کے غلام تھے؟ اس عہد میں کیا صرف ریاستی طاقتوں کا ظلم و جبر نمایاں تھا؟ ان سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہو گا کیونکہ ہم اپنوں کی غلامی کا شکار بھی رہے اپنوں کی اسی ظلم و زیادتی کی ایک صورت ہمیں کریمن بوا ایسے کردار کی بدولت نظر آتی ہے۔ پورے ناول میں وہ کردار گھر آنگن میں موجود ہر شخص کی فکروں میں خود کو ہلکان کرتا نظر آتا ہے حتیٰ کہ اسرار میاں سے خاص وجوہات کی بنا پر خار کھانے کے باوجود اس کے لئے کھانے کا انتظام کرنا

،گھر کے ہر فرد کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، اور اس گھر میں خیر و برکت کی غرض سے گھنٹوں بیٹھے قرآن پڑھنا اور دعائیں مانگنا، بظاہر خوش اور مطمئن نظر آنے والا یہ کردار ناول کے آخر میں اس سارے نظام کو ننگا کر دیتا ہے جس نے صرف ملکی سطح پر قبضے کا تصور پیدا نہیں کیا تھا بلکہ وہ تصور اس حد تک رائج ہو چکا تھا کہ ہر آنگن نو آبادیاتی شکنجوں میں جکڑا ہوا اور کئی کردار استعمار کاروں کے مکرہ چہروں کی ہو بہو شکل پیش کرتے ہیں اور ظلم و ستم کی وہ داستان نمایاں طور پر سامنے آتی ہے جس نے طبقاتی تقسیم کو جنم دیا اور ایک مخصوص طبقے کو یہ شعور عطا کیا کہ روٹی کپڑے کی بنیادی ضرورت کے بعد ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنے مالکوں سے وفاداری ہے۔ یہ کردار ہندوستانی معاشرے میں موجود ان رویوں کا نمائندہ بن جاتا ہے جس نے طبقاتی فرق کو جنم دیا اور عوام کو ہر طرح کا استحصال سہنے پر مجبور دکھایا گیا۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ظلم و ستم کی داستان صدیوں پرانی ہے طاقتور کا کمزور پر استحقاق فطری عمل ہے لیکن جب ہم ناول "آنگن" کے کرداروں کا سماجی ماحول اور مابعد نو آبادیاتی نظام سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے اس ناول میں زندگی کی حقیقی سچائیوں کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس مخصوص معاشرے کی ترجمانی کا فریضہ بھی سرانجام دیا جو انگریزوں نے ہمارے ہاں رائج کیا تھا۔ کئی سو سالوں کی حکمرانی کے نتیجے میں جب انگریز اپنے مقاصد حاصل کر چکے اور انہیں صاف نظر آنے لگا کہ اب ہندوستانیوں میں ان کے چند رہنماؤں کی بدولت شعور کی جو لہر اجاگر ہو چکی ہے اس میں ہماری بقا مشکل ہے کیونکہ کانگرس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ چکے تھے اور یقیناً انگریزوں کی دوررس نگاہوں نے پاکستان کے قیام کی کہانی کو بھانپ لیا تھا۔ کہنے کی حد تک تو وہ لوگ رخصت ہو چکے لیکن جو نظام اور جن رویوں کی ترویج گزشتہ کئی سالوں میں وہ کر گئے وہ نظام کبھی ختم نہ ہو سکا۔ گروہ بندی کا وہ عمل جو طبقاتی سطح پر انگریزوں نے رائج کیا تھا اس نظام نے پھر کئی طرح کی قباحتوں کو جنم دیا اور ہم کئی حصوں میں بٹ گئے۔ طبقاتی تقسیم سے لے کر نسلی خاندانی تقسیم، لسانی تقسیم، مذہبی تقسیم، معاشی تقسیم، لاقانونیت و طاقت کا عدم توازن، حتیٰ کہ تعلیم بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ استعمار کاروں نے ہر چیز پر قبضہ کا جو تصور پیدا کیا اس کے اثرات قومی و تہذیبی ثقافت پر بھی صاف نظر آنے لگے۔

ناول کے ابتدائی صفحات پڑھنے کے بعد قاری اپنے تنقیدی شعور کی وساطت سے اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ مصنفہ نے اس ناول میں اس دور کی قباحتوں کی ترجمانی کا فریضہ احسن طریقے سے سرانجام دیا ہے۔ مسلمانوں کے اسی شدت پسندانہ گروہ کی وجہ سے نوجوان نسل تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ گئی اور پھر خودرو پودے کی طرح جس کا جدھر کو جی چاہا وہیں نکل گیا اور پھر بعد میں یہی لوگ سیاسی لیڈروں کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے ان انسانوں کا بے دریغ استعمال صرف اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کیا۔ اس ساری صورت حال میں وہ نفرت اور تعصب پسندی کے وہ رویے کبھی ختم نہ ہو سکے جن کے منفی نتائج ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

اسی چار دیواری کے گھر آنگن میں صفحہ قرطاس پر ایک کردار نجمہ پھوپھی کا سامنے آتا ہے جس کی وساطت سے ہم انگریزوں کی تشکیل دی گئی لسانی اور تعلیمی تقسیم سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ نجمہ پھوپھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد خود کو پڑھا لکھا جبکہ باقی وہ تمام لوگ جن کا انگریزی زبان سے کوئی خاص واسطہ نہیں، انہیں اس قدر کمتر گردانتی ہے کہ جاہل کہنے سے بھی گریز نہیں کرتی ۔ گزشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایسے حالات میں مسلمان کئی گروہوں میں بٹ چکے تھے مسلمانوں کی جماعت ہی سے ایک گروہ ایسا تھا جو انگریزی تعلیم کا پروردہ تھا اور خالص انگریزوں کا خیر خواہ۔ یہ گروہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود

اپنے ارد گرد کے لوگوں پر گہرے اثرات مرتب کرتا رہا۔ مصنفہ نے ناول میں نجمہ پھوپھی ایسے کردار کو بھی اسی گروہ کا نمائندہ دکھایا ہے انہیں قباحتوں کو ناول میں عالیہ اور نجمہ پھوپھی کے مکالمے نے واضح انداز میں بیان کیا ہے۔

> "برقع ہاتھ پر ڈالے جب وہ زینے طے کرنے لگی تو آگے آگے نجمہ پھوپھی بہت اونچی ایڑیوں کی سینڈل پر جھومتی اتر رہی تھیں "استانی جی تانگہ آگیا ہے" نجمہ پھوپھی نے گردن گھما کر کہا۔ ان کے ہونٹوں پر کیسی مضحکہ خیز مسکراہٹ تھی۔" ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں، مگر آپ لکچرار کہی جاتی ہیں اور میں استانی، یہ فرق اگر نہ بھی مٹے تو کیا قیامت آجائے گی نجمہ پھوپھی" عالیہ نے تلخی سے جواب دیا۔-----------------------------،" واہ یہ فرق مٹ بھی کیسے سکتا ہے، کیا تم نے انگلش میں ایم۔اے کیا ہے؟ گدھے اور گھوڑے میں کوئی فرق تو ضرور ہوتا ہے"
> (۸)

اسی کردار کا مطالعہ اگر ہم مابعد نو آبادیاتی تناظر میں کریں تو کئی ایسی صورت حال سے نبرد آزما نظر آئیں گے جس نے ہماری قومی اور ثقافتی شناخت کو مسخ کر دیا ہے۔ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے ناول میں قیام پاکستان سے پہلے کی جو صورت حال بیان کی ہے وہ آج کی صورت حال سے مختلف ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہو گا کیوں کہ ہم آج بھی انگریزی تہذیب اور زبان کے چکروں میں الجھے ہوئے ہیں ہم آج بھی اردو زبان میں بات کرنے والوں کو بعض اوقات اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان سے ہمکلام ہوں۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں صورت حال اس قدر گھمبیر ہو چکی ہے کہ ہم اردو پڑھنے والوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے انگریزی کے دو چار ٹوٹے پھوٹے جملے بولنے والے لوگوں کو ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہمارے ایوانوں کی صورت حال یہ رخ اختیار کر چکی ہے کہ ہمیں اگر نفاذ اردو کی ضرورت اور اہمیت پر بات کرنی ہو تو ہم انگریزی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں احساس برتری کی اس صورت حال میں ہماری نوجوان نسل بالخصوص ہمارا تعلیمی نظام متاثر ہوا انگریزوں نے طبقاتی تقسیم کے لحاظ تعلیم کو بھی کئی حصوں میں منقسم کیا۔

> " تعلیم کہ جس کے ذریعے سے رواداری، بے داغ انسانیت، قومی یکجہتی اور بین الاقوامی سبقت جیسے اعلیٰ مقاصد بھی حاصل کئے جانے چاہئیے تھے ہم نے فقط ذاتی منفعت جیسے ادنیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا ڈالا۔ نو آبادیاتی نظام تعلیم کو ہم نے مزید طبقاتی ٹیکہ لگا کر نئی نسلوں کی compartmentation کر ڈالی"(۹)

ان تصریحات سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اشتراکی بنیادوں پر انگریزوں نے جو طبقات تشکیل دیئے انہوں نے استحصال اور کشمکش کی کئی ایسی صورتوں کو جنم دیا جو آج تک جوں کی توں موجود ہیں۔ تاریخ کے عمیق مطالعے سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ ہمارے درمیان جو طبقات وجود میں لائے گے انہوں نے سب سے زیادہ نقصان انسانی تہذیب اور ثقافتی تاریخ کو پہنچایا۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کلاسوں میں بٹے ہوئے معاشرے کو ایک ہی صف پہ اکٹھا کریں تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ان تمام قباحتوں سے محفوظ رہ سکیں کیوں کہ:

> نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ چار کلاسوں کے لوگ آپس میں اکٹھے بیٹھ نہیں سکتے، رشتے ناطے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی ایک کلاس کا فرد دوسری طرف فلور کراسنگ کر جائے تو اسے

بھی نئی کلاس میں قبول کیے جانے کیلئے کم از کم ایک نسل کی قربانی دینا پڑتی ہے ان بکھرے ہوؤں کو قومی یکجہتی میں کس طرح مجتمع کیا جائے گا کام مشکل اور وقت طلب تو ہے مگر ممکن ہونے کے ساتھ ساتھ ناگزیر بھی ہے۔ پر عزم تعلیمی اصطلاحات سے ہمیں اس تقسیم کا سنبھالنا ہو گا"(۱۰)

اگر ہمیں فکری و ذہنی سطح پر آزادی چاہیئے تو ضروری ہے کہ ہر قسم کے امتیازات کو ختم کرنے کی کوشش کریں کیوں کہ یہی کوششیں دراصل ہمیں جینے کی صلاحیت بخشنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے نقشے پر ابھار سکتی ہے۔ اگر ہم ناول میں موجود سیاسی رویوں کی نشاندہی کریں تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں سیاست کبھی مستحکم نہیں ہو سکی ہم نے اپنے مفادات کی خاطر سب سے زیادہ نقصان سیاست کو پہنچایا۔ قیام پاکستان سے پہلے کی سیاسی صورت حال انگریزوں کی مرہون منت رہی سیاسی پالیسیاں انہیں کی مرتب کی ہوئی تھیں، ناول میں موجود تمام کردار ہمارے سیاسی رویوں کے بہترین ترجمان ہیں ہمارے ہاں ہمیشہ سے دو رویے پروان چڑھے یا تو ہم بغیر سوچے سمجھے سیاستدانوں اور سیاسی پالیسیوں کے حمایتی نظر آتے ہیں یا پھر شدت پسندی اور نفرت و غصے کے جذبے سے مغلوب ہو کر بلاوجہ کا بیر باندھ لیتے ہیں انہیں دونوں رویوں نے ہمارے ہاں سیاسی صورت حال کے اس تناظر کو ابھرنے ہی نہیں دیا جو ترقی یافتہ اقوام کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

غلامی کی اس صورت حال نے نفرتوں کے الگ الگ زاویے جنم دیئے استعمار کاروں نے جو معاشی و معاشرتی حکمت عملیاں ترتیب دیں وہ سب کی سب سیاست کو مستحکم کرنے کا حربہ تھیں اس صورت حال میں ہر جماعت کی نظر میں دوسری جماعت ملک کی غدار نظر آتی تھی اسی کشمکش سے ہماری تاریخ میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جس نے تہذیب اور ہماری اقدار کا قتل عام کیا۔ کہنے کو تو ہمارا تعلق مہذب اور ترقی یافتہ اقوام سے ہے لیکن اس اشرف المخلوق نے کیسے کیسے مظالم سے تاریخ مرتب کی مصنفہ اس بات کی وضاحت عالیہ کی زبانی ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

" اقتدار کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ لاکھ تہذیب جنم لیتی رہے کچھ نہیں بنتا اقتدار سب کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ ہے کہ اب ہم مہذب ہو چکے ہیں۔ سروں کے مینار بنانا اور انسانوں کو پنجروں میں بند کرنا تو صدیوں پرانی وحشت کے دور کی یادگاریں ہیں، مگر آج جو جنگ ہو رہی، ایک سے ایک بڑھیا بم لو، جس سے سب سے زیادہ بے گناہ مریں وہی سب سے ترقی یافتہ ہتھیار۔۔۔۔۔۔"(۱۱)

درج بالا مکالمہ تاریخی شعور کی ان گتھیوں کو سلجھاتا ہے جو ہمیشہ سے ہماری نام نہاد سیاست کی نظر ہوتی آرہی ہیں، لیکن جب ہم ۱۹۴۷ء کے بعد کا منظر نامہ سامنے لائیں تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سماجی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور بالخصوص سطح پر متحد ہو چکے ہیں؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہی دیا جائے گا کیونکہ ہمارے حکمرانوں نے ہر سطح پر قوم کا استعمال اپنے مفادات کی غرض سے کیا سادہ لوح عوام کو کئی خواب دکھانے کے بعد انہیں اجتماعی خوابوں کو انفرادی ترقی کا زینہ بنایا گیا۔ ناول "آنگن" پیشکش کے لحاظ پہلے تین حصے قیام پاکستان سے پہلے کی داستان سناتے ہیں جبکہ آخری حصہ پاکستان بننے کے بعد کی کہانی ہے۔ دونوں حصوں کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی کے بعد بھی مسائل جوں کے توں رہے۔ نو آبادیاتی نظام کی نئی صورتیں نئے نام سے وجود میں آئیں قبضے کا جو تصور نو آبادکاروں نے رائج کیا اور سامراجی مفادات کی خاطر پوری قوم کو اپنا یرغمال بنایا اس نظام کی کئی صورتیں پاکستان میں ابھریں جن سے ہر طاقتور طبقے نے فائدہ اٹھایا ناول میں اس بات کی وضاحت عالیہ کے ماموں کے کردار کے توسط سے کئی گئی ہے۔

"ایک دن ماموں اکیلے آئے تو انھوں نے بتایا کہ کوٹھی اماں کے نام الاٹ کرا دی ہے اب اسے کسی صورت چھوڑنا نہیں پھر انہوں نے فرنیچر وغیرہ کی رسیدیں دیں کہ اگر کوئی پوچھے تو یہ دکھا دینا کہ ہم نے یہاں آکر سب کچھ خریدا ہے، اس کوٹھی میں تو بس کباڑ بھرا تھا"(۱۲)

وطن عزیز پر مسلط طاقتور طبقات نے تہذیب و ثقافت کے ان بہترین رویوں کو کبھی ابھرنے ہی نہیں دیا جو کسی بھی نو آزاد ملک میں جمہوریت کے استحکام میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ روایتوں اور قدروں کے انہدام کی انھی صورتوں نے ادیب اور دانشور طبقے کو ان مسائل کے اجاگر کرنے کا شعور عطا کیا کیوں کہ معاشرے کی تخلیق میں ادب بالواسطہ طور پر اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تخلیق کاروں نے بھی زندگی کا حقیقی عکس اور معاشرے کے حالات و واقعات اصل حقائق سے بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

ان تصریحات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد منظر عام پر آنے والا ادب اس سیاسی و سماجی نظام کی تصویر کشی کرتا تھا جو استعمار کا روجود میں لائے۔ پاکستان کی موجودہ سیاسی اور سماجی صورت حال کا مطالعہ کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارباب اختیار ہمیشہ سے وطن عزیز پر قابض رہے۔ ۱۹۶۲ء میں خدیجہ مستور کا تخلیق کیا گیا ناول "آنگن" جو ہندوستان کے گھر آنگن کی کہانی بیان کرتا ہے لیکن اگر ہم روایتی تنقید سے ہٹ کر دیکھیں تو اس ناول کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ مصنفہ نے صرف چار دیواری کے کسی آنگن کی کہانی بیان نہیں کی بلکہ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ان تمام قباحتوں کو بیان کر دیا جس نے ہمیں آج تک سیاسی اور سماجی حوالے سے مستحکم نہیں ہونے دیا۔ وہ رویے جو پاکستان سے پہلے ہندوستانی معاشرے میں سماج کے اجارہ داروں کے مرہون منت تھے ان سے چھٹکارا ہم آج تک حاصل نہیں کر سکے۔

حوالہ جات

1.Postcolonialism,Wikipedia(https://en.m.wikipedia.org/wiki/Postcolonialism.

۲۔ امتیاز عبد القادر، پس نو آبادیات، مشرق کی بازیافت کی تحریک، مشمولہ، اوری ئینٹل کالج میگزین، جلد ۹۱ (لاہور، اوری ئینٹل کالج، ۲۰۱۶ء، ص:۱۴۶

۳۔ لطف الرحمٰن، مابعد نو آبادیاتی تہذیبی جارحیت ،مشمولہ، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات ، مرتب محمد عامر سہیل،(لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص:۸۳

۴۔ خدیجہ مستور، آنگن، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص:۲۸۲۔۲۸۳

۵۔ ایضا، ص:۱۹۲

۶۔ ایضا، ص:۱۳۴

۷۔ ایضا، ص:۱۳۴۔۱۳۵

۸۔ ایضا، ص:۲۴۱

۹۔ زیڈ آئی فرخ، انقلاب پاکستان، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص:۳۹

۱۰۔ خدیجہ مستور، آنگن، ص:۴۰

۱۱۔ ایضا، ص:۱۷۳

۱۲۔ ایضا، ص:۲۹۰

References in Roman Script:

1. Postcolonialism,Wikipedia(https://en.m.wikipedia.org/wiki/Postcolonialism.
2. Imtiaz Abdul Qadir, Pas-e-No-Abadiat, Mashqir Kay Bazayfat Ki Tehreek,Mashmola, Orantial College Magzine, Vol .91, Lahore،Orantial College,2016,P.146.
3. Lutuf Ur Rehman, MabadNoAbadiati Tehzebi Jarhiyat, Mashmola, NoAbadiat O Mabad-No -Abadiat,Muratba Muhammad Amir Sohail, (Lahore: Aks Publication, 2019), P.83.
4. Kahdija Mastoor, Aangan, (Lahore: Sang Meel Publications, 2019), P. 283,284.
5. bid, P.192.
6. Ibid,P.134.
7. Ibid, P.134,135.
8. Ibid, P.241.
9. Z I Farrukh, Inqalab E Pakistan,Lahore,Jamhori Publications,2013, P. 39.
10. Kahdija Mastoor, Aangan,P. 40.
11. Ibid,P. 173.
12. Ibid,P. 290.